Regd. No. L. 922.

انجمن ترقی اردو ہند کا ہفتہ وار اخبار

ہماری زبان

جلد ۲۴۔ شمارہ ۴۸ | ایڈیٹر: آل احمد سرور | ۲۲ دسمبر ۱۹۶۵ء

آل احمد سرور

سمرسٹ مانم — ایک تاثر

۱۶ دسمبر کو نیس (فرانس) میں ۹۱ سال کی عمر میں انگریزی کے اس مشہور ناولسٹ، افسانہ نگار اور ڈراما نویس کا انتقال ہوگیا۔ ۱۱ دسمبر کو اس پر فالج کا حملہ ہوا اور چھ دن تک وہ بے ہوش رہا۔ چرچل کی طرح اس نے بھی آسانی سے ہار نہیں مانی، مگر بالآخر اُسے اس دنیا سے رخصت ہونا ہی پڑا۔ اس کا جسم اس کی وصیت کے مطابق راکھ ہو جائے گا لیکن اس کا نام اور کام باقی رہے گا۔

مانم ادھر کئی سال سے خاموش تھا۔ مطبوعہ چیزوں کے علاوہ اُس نے جو کچھ لکھا تھا وہ بھی جلا دیا تھا۔ اس نے اپنی آمدنی کا بڑا حصہ تہی دست مگر ہونہار ادیبوں کی امداد کے لیے وقف کر دیا تھا۔ اس نے بہت کمایا اور نوجوانی میں کچھ دن کی تنگی ترشی کے علاوہ اچھی خاصی فارغ البالی کی زندگی بسر کی۔ اُسے سیاسیات، جلسوں سے ہنگاموں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ صبح کو چار گھنٹے جم کر کام کرتا تھا اور باقی وقت تفریح اور آرام میں گزارتا تھا۔ شکل سے وہ فنکار کے بجائے کسی بینک کا منیجر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا ایک مخصوص حلقۂ احباب تھا ویسے وہ زیادہ سوشل نہ تھا۔ اس نے ساری دنیا کی سیر کی تھی اور جنوبی ایشیا اور ہندوستان تو کئی دفع آیا تھا۔ اس نے وکٹوریہ کے عہد کی شان و شوکت دیکھی جب انگریزی سامراج کا سورج نصف النہار پر تھا۔ اس نے پہلی جنگ عظیم میں سراغ رسانی کا کام بھی کیا۔ دوسری جنگ عظیم کی ہلاکت اور حشر خیزی بھی اس کی نظر سے گزری۔ اسے انگلستان سے زیادہ جنوبی فرانس کا سنہرا ساحل عزیز تھا۔ اس نے نقادوں کی زیادہ پروا نہیں کی اور نہ نقادوں نے اس کے قصیدے گائے۔ مگر وہ اس دور کا بڑا اچھا قصہ گو، زندگی کا بڑا پرخلوص تماشائی اور انسانی فطرت کا بڑا اچھا نباض تھا۔ کچھ لوگ اسے کلبی کہتے تھے، کچھ قنوطی، کچھ سطحی، مگر اسے پڑھتے سب تھے۔ وہ بڑی صاف ستھری اور رواں نثر لکھتا تھا۔ اس کے ناول CAKES AND ALE، OF HOMAN BONDAGE اُس کی کم سے کم ایک درجن کہانیاں جن میں THE FALL OF EDWARD BERNARD، JANE، OUTSTATION، VIRTUE، RAIN، THE ILLUSION AND REALITY اور اس کا ڈراما "THE CIRCLE" ذہن پر ایک غیر فانی نقش چھوڑتے ہیں اور کبھی بھلائے نہیں جا سکتے۔ اس نے "COSMOPOLITANS" میں ثابت کر دیا کہ موپساں کی طرح چند صفحوں میں ہیرے کی طرح ترشے ہوئے افسانے انگریزی میں لکھے جا سکتے ہیں۔ اس کی کئی کہانیوں سے بڑے کامیاب فلم بنائے گئے ہیں جن کی تیاری میں اس نے مدد کی تھی۔

مجھے مانم ہمیشہ پسند رہا۔ گو اس کے زندگی کے نظریے کو میں کبھی قبول نہ کر سکا۔ مجھے اس کے قصوں کی چستی، اس کے کردار کی منہ بولتی تصویریں، اس کا زندگی کے پست و بلند کو بہرحال

اس شمارے میں

یہ تسلیم کرنا، اس کا فیشن یا نادر موضوع کے سہارے چلنے کے بجائے اپنی بات اپنے دھیمے اور پراثر انداز میں کہے جانا، اچھا لگتا تھا۔ گو میں صرف انھیں باتوں سے ذہنی طور پر آسودہ نہیں ہو پاتا۔ میں نے ماہم کا تقریباً ہر ناول، اس کا تقریباً ہر افسانہ اور اس کے کچھ ڈرامے، اس کا سفرنامہ اور اس کا اعتراف "THE SUMMING UP" پڑھا ہے۔ مجھے تو اس کی وہ کہانیاں بھی پسند ہیں جو اس نے ASHENDEN کے نام سے لکھیں۔ اس کا ہلکا سا تمسخر کا انداز جو ALROY KEAR کی عکاسی میں صرف ہوا ہے، اس کا وہ بے لاگ اور کچھ بے رحم مرقع جو STRICKLAND کی جینیس اور اس کی من کی موج کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی وہ موہنی تصویر جو ROSIE کے نشاط زیست کے تصور کو خواہ وہ اخلاقی اعتبار سے کیا ہی معلوم ہوتا ہو کسی نہ کسی طرح گوارا بنا دیتی ہے، میں کسی طرح بھلا نہیں سکتا۔ ماہم بڑا فن کار نہیں تھا۔ لیکن وہ اچھا فنکار تھا۔ اس نے ہمالیہ کی بلندیوں کو نہیں چھوا۔ انسانی روح کی پرواز سے اسے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ وہ وادیوں میں بستے کھیلتے، لڑتے، خون خرابہ کرتے، دھوکا دیتے، پیار کرتے انسانوں سے، ان کے اندر تضاد سے، ان کی جلد کی سپیدی میں روح کی سیاہی سے اور کسی کے سیاہ چہرے کے اندر شفافی باطن سے، بڑا شغف رکھتا تھا۔ اور اس لیے وہ ہر نقاب میں جھانکتا تھا، ہر رخسار کے غازے کے اندر جھریاں تلاش کرتا تھا اور کبھی کبھار جھریوں دار چہرے میں حسن کی جھلک دیکھ لیتا تھا تو بے خود ہو جاتا تھا۔ اس کے افسانے زندگی کے چہرے پر سوالیہ نشان ہیں۔ وہ زندگی کے سوالوں کی نیرنگی اور بوقلمونی کو دیکھتا تھا۔ ان کے جوابوں کی فکر نہیں کرتا تھا۔ اس نے کروڑوں انگریزی پڑھنے والوں کو بڑے مزے مزے کے قصے سنائے۔ ان کے لیے بڑی مسرت کا سامان مہیا کیا اور خاصی بصیرت کا بھی۔ اس کا ذہن مریض نہیں تھا۔ وہ یک رخا یک حرفہ بھی نہیں تھا۔ اس کی تصانیف میں انسان اپنی فطرت کی ساری نیرنگیوں کے ساتھ ملتا ہے۔ ان نیرنگیوں کے احساس میں جو مزہ ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں۔ انھیں کی وجہ سے انسان اپنی ساری کمزوریوں کے باوجود قابل قدر اور اپنے سارے گناہوں کے باوجود معصوم معلوم ہوتا ہے۔

ماہم کی بہت سی کہانیوں کا اردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ ہمارے نئے لکھنے والوں پر اس کا اثر ہے۔ منٹو کو تو ہم اردو کا ماہم بھی کہہ سکتے ہیں۔ آج بھی ہمارے افسانہ نگار ماہم سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ وہ ایک اچھا فنکار ہی نہیں اچھا معلم بھی ہے۔ افسانہ لکھنے سے پہلے اس نے خاصا وقت انگریزی کے اچھے نثر نگاروں کی تقلید میں گزارا تھا۔ ہمارے افسانہ نگاروں میں سے بہت سوں کو اچھی نثر لکھنی نہیں آتی۔ ماہم سے انھیں یہ نکتہ بھی سیکھنا چاہیے۔

سومرسٹ ماہم کا انتقال

نائس، ۱۶ دسمبر: برطانیہ کے مشہور ناول نگار سومرسٹ ماہم کا آج صبح یہاں ۹۱ برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔

ماہم نے ۱۹۵۸ء سے تصنیف تالیف کا کام بند کر دیا تھا۔ اسی سال سے ان کی بینائی اور قوت سماعت جواب دے گئی تھی۔

ان کی تصانیف کا دنیا کی بیشتر زبانوں میں ترجمہ ہوا تھا اور وہ اس صدی کے مقبول ناول نگاروں کی صف اول سے تعلق رکھتے تھے۔

وہ برطانی شہری تھے لیکن انھوں نے فرانس میں سکونت اختیار کر لی تھی۔

ان کا ولا شاندار دعوتوں اور محفلوں کے لیے فرانس کے ادبی حلقوں میں مشہور تھا۔

وہ گذشتہ ہفتے اپنے ولا کے ہال میں چہل قدمی کرتے ہوئے فرش سے الجھ کر گر گئے تھے۔ ان کی نرس نے انھیں بستر پر لٹایا تھا وہ اس وقت سے برابر بے ہوش تھے اور ایک نرسنگ ہوم میں زیر علاج تھے۔

۸۰ برس کی عمر تک پہونچنے پر وہ ۸۰ سے زیادہ ڈرامے اور اتنے ہی ناول لکھ چکے تھے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اپنی سوانح حیات بھی قلم بند کی تھی۔

ماہم برطانی نژاد والدین کے گھر میں ۲۵ جنوری ۱۸۷۴ء کو پیرس میں پیدا ہوئے انھوں نے انگلینڈ اور جرمنی میں تعلیم حاصل کی۔ ماہم ایک سیاح تھے جس کی وجہ سے ان کی تصانیف میں ایک عالمی مزاج پیدا ہوا۔

جب وہ جرمنی کی ہیڈلبرگ یونیورسٹی میں تعلیم پا رہے تھے تو لندن واپس آئے جہاں انھوں نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی اور پھر انھوں نے تصنیف و تالیف کی خاطر ڈاکٹری کا پیشہ ترک کر دیا۔

۱۹۵۴ء میں ملکہ الزبتھ نے ماہم کو اعزازی مصاحب بنا لیا وہ فرنچ لیجن کے کمانڈر تھے۔ آکسفورڈ اور دوسری یونیورسٹیوں نے انھیں ادب کی اعزازی ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں دیں۔ وہ لائبریری آف کانگریس واشنگٹن کے فیلو تھے۔ اور امریکا کی فن و ادب کی قومی سوسائٹی کے اعزازی رکن۔

—— ✻ ——

جے کرشن چودھری حبیب

اُردو شاعری میں قومی جذبات

اردو خالص ہندوستانی ہے۔ یہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی۔ یہاں کی گلیوں میں کھیل کود کر بڑی ہوئی پرورش پائی اور پروان چڑھی، بجولیوں سے عزت و آبرو پائی، بھر بزرگوں میں مقبول ہوئی اور درباروں میں منظور نظر بنی۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے یکساں طور پر اپنے دل میں جگہ دی اور اس نے دونوں کے دلوں کی دوئی شادی اور ہندوستانی عوام کی زبان بن گئی۔

اس لیے اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں کہ اردو عوام کی زندگی کے ہمیشہ قریب رہی۔ عوام کی زندگی کا اتار چڑھاؤ، خوشی اور غم، امیدیں، امنگیں اور آرزوئیں حتیٰ کہ دل کی دھڑکنیں بھی اردو شاعری میں صاف صاف سنائی دیتی ہیں۔ دل کی ہر کیفیت، جذبے اور احساس کا ایک عکس ہمارے شاعروں کے کلام میں نظر آتا ہے۔ قومی زندگی کے ہر دور میں اس نے ہمارے جذبات کی ترجمانی کی اور قومی تحریک کو عوام تک پہنچایا۔ اس نے ہمیشہ ملک کے فائدے کو سامنے رکھا، آنے والے خطروں پر نظر ڈالی اور وقت پر ہمیں آگاہ کیا۔ خطرے کے وقت نہ صرف ہمارے قومی جوش اور جذبے کو ابھارا بلکہ آگے صحیح راہ بھی دکھائی۔ نوجوانوں کو قوت عمل بخشی اور ملک والوں کو ایکتا، اتحاد، مذہبی رواداری، پیار محبت کا سبق دیا۔ ہماری قومی کمزوریوں، غریبی، جہالت اور مذہبی اور سماجی تنگ نظری کے خلاف آواز اٹھائی۔ شاعروں نے اپنے قلم کے وہ جوہر دکھائے کہ غلامی، غفلت، قومی بے حسی، اداسی، نراشا، اور کمتری کے احساسات آہستہ آہستہ ہمارے دلوں سے جاتے رہے اور ان کی بجائے عزم و ارادہ کی مضبوطی اور آزادی کی تڑپ ہمارے دلوں میں چٹکیاں لینے لگی۔ ہمارے شاعروں نے آزادی کے راگ الاپے ہماری قومی غیرت کو جھنجوڑا اور ہمیں اپنی منزل کی طرف بڑھنے کے لیے آمادہ کیا۔ کئی شاعروں نے نہ صرف منزل کی طرف اشارہ کیا بلکہ خود بھی جیل کی مصیبتیں خوشی خوشی جھیلیں۔ حسرت موہانی نے جیل کے اندر ہی کہا تھا۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی

کئی وطن پرست شاعروں نے پھانسی کے تختوں پر بھی اپنے وطن سے وفا اور محبت کے گیت گائے۔ رام پرشاد بسمل کی اس انداز کی غزل اپنے اندر بے پناہ جذبہ رکھتی ہے۔ ایک شعر سنیے!

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

کلاسیکل اردو شاعری میں وطن کی طرف دھیان بہت کم دیا گیا وہ کلام حسن و عشق تک ہی محدود رہا۔ یہ فارسی شاعری کے اثر کی وجہ سے تھا۔ کلاسیکل شاعروں میں سب سے پہلا شاعر نظیر اکبرآبادی ہے جس نے عام راہ سے ہٹ کر اپنی غزلوں میں ہندوستانی عوام کی روزمرہ زندگی، ان کے دکھ سکھ اور ان کے خیالات کو شاعری کا لباس پہنایا۔ اس کو اپنے وطن، اسی کے باشندوں، آب و ہوا، رسم و رواج اور روایات سے گہری محبت اور دلچسپی تھی۔ اس نے مزے لے لے کر یہاں کے میلوں، ٹھیلوں، ہولی اور دیوالی کے تہواروں اور عام لوگوں کے شغل اور دلچسپیوں کا ذکر کیا ہے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بڑا وطن پرست شاعر تھا۔

نظیر کے بعد غالب کے دور تک اس مذاق کا اور کوئی شاعر نہیں ابھرا۔ غالب نے اپنے لطیف انداز میں اس زمانے کی سیاسی بدحالی کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح شاہ ظفر کے ساتھ دلی کی شان و شوکت جاتی رہی۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے زمانے میں انگریزوں نے وہ ظلم و ستم ڈھائے کہ کلیجہ منہ کو آتا تھا، زندگی اجیرن ہو چکی تھی، زبان کو تالے لگ چکے تھے۔ خوف و ہراس کی ایک ایسی فضا پیدا ہو چکی تھی۔ جس میں سانس لینا بھی مشکل ہو رہا تھا۔

اس گھٹی گھٹی فضا میں جس شاعر نے پہلے پہل زبان کھولی وہ حالی تھا۔ اسی نے آہستہ آہستہ راستہ صاف کرنا شروع کیا۔ اس کی شاعری وقت کی راگنی تھی جس نے نہ صرف اس دور میں اثر پیدا کیا بلکہ آنے والے دنوں میں بھی ہمیں راہ دکھائی۔ شاعری میں لکیر کے فقیر بنے رہنے کی بجائے اس نے اپنی نظموں میں قومی جذبات ابھارے اردو شاعری کے اس دور میں جو نئی راہ حالی نے نکالی، اس راہ پر اقبال، اکبر، اسمٰعیل میرٹھی، چکبست، حسرت، محروم، جوش، فراق، اور دوسرے شاعروں نے قدم بڑھائے اور ملک کے قومی جذبات میں تہلکہ مچا دیا۔

اب میں ان شاعروں کے کلام سے کچھ نمونے پیش کروں گا جن کے لفظ لفظ سے وطن کی محبت ٹپکتی ہے۔ حالی کے دو تین شعر سنئے۔

قفس میں جی نہیں لگتا ہے میرا
لگا دو آگ کوئی آشیاں میں

گو زمانے نے بھلا دی دل سے اپنے منزل گل
یاد ہیں لیکن وہ بلبل کی صدائیں خاص خاص

اس نے کہا کہ ذاتی فائدہ کی بجائے ملک کے فائدے کو سامنے رکھنا چاہیے۔ کیونکہ

بچو گے نہ تم اور نہ ساتھی تمہارے
اگر ناؤ ڈوبی تو ڈوبیں گے سارے

ڈاکٹر اقبال۔

ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا پہلا دور قومی جذبات سے بھرپور ہے

اُس نے ہندوستان کی عظمت اور محبت کے گیت گائے۔ اس کا مشہور ترانہ جو آج سے پچاس سال پہلے بچپن میں ہم جھوم جھوم کر گایا کرتے تھے، آج بھی اپنے اندر زور اور کشش رکھتا ہے۔ ترانے کے دو شعر دیکھیے ؎

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اسی طرح اپنی نظم نیا شوالہ میں کہا ہے ؎
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

غلامی اور آزادی کے سوال پر غریبوں کو جگاتے ہوئے اس نے کہا ہے۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

اکبر۔

اکبر نے جب آنکھیں کھولیں تو ہمارے ملک کا سارے سماجی اور سیاسی ڈھانچہ بدل رہا تھا۔ اکبر کو جس نے خالص مشرقی یا اسلامی ماحول میں پرورش پائی تھی یہ رنگ ناگوار گذرا اور وہ نئے فیشن اور نئی تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے طنز و ظرافت کے تیر و نشتر لے کر میدان میں ڈٹ گیا اور دل کھول کر اڑائے۔ جلوۂ دربار دہلی کے نام سے جو نظم لکھی اس میں بیان کیا کہ اس نے وہاں کیا دیکھا چار شعر ملاحظہ ہوں۔

اوج برٹش راج کا دیکھا
رنگ زمانہ آج کا دیکھا
پرتو تخت و تاج کا دیکھا
رخ کرزن مہاراج کا دیکھا
موج بہجت طاقی اُن کا
محفل ان کی ساقی اُن کا
چرخ ہفت طباقی اُن کا
آنکھیں میری باقی اُن کا

آخری مصرعہ آنکھیں میری باقی اُن کا میں اس نے کیا کچھ نہیں کہا۔ طنز بھی ہے اور قومی بے بسی کا بیان بھی۔ کچھ شعر دیکھیے۔

بچوں میں خو آئے کیونکر باپ کے اطوار کی
دودھ تو ڈبے کا ہے تعلیم ہے سرکار کی

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں
گو گردِ راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں

ہندو مسلم اتحاد پر کہا ہے ؎

کہتا ہوں ہندو مسلمان سے یہی	اپنی اپنی روش پہ تم نیک رہو
آئی ہے ہوائے دہر تم پانی بن جاؤ	موجوں کی طرح لڑو مگر ایک رہو

حسرت موہانی۔

حسرت موہانی کی وطن پرستی پر دو شعر دیکھیے ؎

رسم جفا کامیاب دیکھیے کب تک رہے
حب وطن مست خواب دیکھیے کب تک رہے
دولتِ ہندوستاں قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھیے کب تک رہے

حسرت کی اسی جرأت اور دلیری پر اسے جیل بھیج دیا گیا اور یہ شاعری اور جیل کا سلسلہ آخر تک رہا۔

چکبست۔

چکبست نے اپنی شاعری میں وطن کی محبت کے گل بوٹے کھلائے۔ ان دنوں ہوم رول کی تحریک زوروں پر تھی۔ چکبست بھی اس میں شامل ہوا اور ان ہی نظموں سے قومی جذبات کو ابھارا۔ چند شعر ملاحظہ ہوں ؎

بو تری در زنداں کے ہو بھی جائیں گے
یہ راگ گا کے انہیں نیند سے جگائیں گے
طلب فضول ہے کانٹوں کی پھول کے بدلے
نہ لیں بہشت بھی ہم ہوم رول کے بدلے

دل میں اس طرح سے ارمان ہیں آزادی کے
جیسے گنگا میں جھلکتی ہے چمک تاروں کی

غنچے ہمارے دل کے اس باغ میں کھلیں گے
اس خاک سے اٹھے ہیں اس خاک میں ملیں گے

محروم

محروم نے دورِ غلامی کی نظموں سے غلامی کا احساس کرایا اور آزادی کی تحریک کو طاقت بخشی۔ دو شعر ملاحظہ ہوں۔

بھارت کے نوجوانو اک بزم تو جمائیں
حب وطن کی شمعیں اس بزم میں جلائیں
حب وطن کی مے کا چلتا ہو دور پیہم
بھر بھر کے جام و ساغر باہم پئیں پلائیں

جوش ملیح آبادی۔

جوش ملیح آبادی نے اپنے پرجوش کلام سے ہمارے دلوں کو گرمایا اور اپنے نعرۂ انقلاب سے قوم کو جگایا ہے ؎

ملک کو جذبۂ بیدار دیے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیے دیتا ہوں

کام ہے میرا تغیر نام ہے میرا شباب
میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب

(باقی صفحہ پر)

حسن شہیر

ولادت

(۱)

تاریخ کا حسن صدا بہار حسن ہے
اس پہ گرد جمتی نہیں ہے
اس پہ صدیوں کی ریکھائیں ہیں
جو بولتی ہیں
بات کرتی ہیں
لمحہ لمحہ جو خاموش آنکھوں سے دیکھتی ہیں
کچھ کہتی نہیں ہیں
درد اور کرب کے ایندھن میں جلتی ہیں
ٹمٹماتے ہوئے دیپ جل رہے ہیں
تاریخ مسکرا رہی ہے
گگن پہ بے شمار ستارے ٹنگے ہوئے ہیں
رقص کرتے ہیں ـــ روشنی میں
صدیوں کے یہ پھول محو گفتگو ہیں
ان سے لاوا پھوٹ رہا ہے
دھماکے کی آواز آ رہی ہے
شور ہے سناٹے میں ـــ ہر طرف
تاریخ مسکرا رہی ہے

(۲)

آندھیوں میں آفاق پہ روشنی ہو رہی ہے
ایک نیا پھول کھل رہا ہے
چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے دیکھتا ہے
تاریخ کا یہ پھول ہے
جو ہمیشہ مسکراتا رہتا ہے
اور صدیوں کے آنگن میں ٹہلتا ہے

عنوان چشتی

قطعات

(۱)

زندگی کو دوئی سے کیا نسبت؟
صبح عارض ہی شام گیسو ہے
عشق کے آئینے میں دیکھ اے دوست
زندگی کا ہر ایک پہلو ہے

(۲)

زندگی کے نگار خانے میں
عشق عنوان حسن قصہ ہے
میرا دل ہو کہ آپ کا جلوہ
ایک ہی خواب و فکر کا حصہ ہے

اردو قومی یک جہتی کی آئینہ دار

(یادگار زمیر کمیٹی لکھنؤ کے زیر اہتمام ۲۱ دسمبر ۶۵ء کو زیر صدارت مظفر احمد فاروقی قومی مشاعرہ کیا گیا۔ اس موقع پر فاروقی صاحب نے جو خطبہ پڑھا اس کے اہم حصے درج ذیل ہیں۔ — ادارہ)

اردو زبان اور اس کے ادیبوں اور شاعروں نے ہمیشہ ملک کی یک جہتی سالمیت اتفاق و اتحاد کے لیے کوشش کی ہے، حب وطن کے ترانے گائے ہیں اس کی ایک مٹھی بھر خاک کے بدلے بہشت بھی لینا گوارا نہیں کیا

تیری اک مشت خاک کے بدلے　　لوں نہ ہرگز اگر بہشت ملے

باہمی میل ملاپ مشترکہ تہذیب قومیت کی یہی زبان علمبردار رہی اور اب بھی ہے۔ غلامی کے خلاف اس نے سب سے زیادہ اور پُر جوش کوشش کی، آزادی کی تحریک میں اس کی بدولت وسعت توانائی پیدا ہوئی، ملک کے کونے کونے میں اسی کا نعرہ حب وطنی و آزادی گونجا یہاں تک کہ وہ وقت آگیا کہ اگست ۴۷ء میں ملک آزاد ہو گیا یہ فخر بھی اسی زبان کو حاصل ہوا کہ آزادی کا پہلا علمبردار اور ملک کا پہلا سربراہ اسی کا ایک عظیم اور شہرۂ آفاق فرزند تھا جس نے اسی مسکن لال قلعہ پر آزادی کا پرچم لہرایا۔ آزادی کے بعد بھی یہ اپنے فرائض سے غافل نہیں رہی۔ آزادی کو تقویت بخشنے جمہوریت کے استحکام اور قومی یک جہتی کے لیے اس نے ہر قسم کی قربانیاں پیش کیں اور باوجود مشکلات کے اپنا فرض ادا کرتی رہی۔ آج لاکھوں بچے اپنی مادری زبان کی تعلیم سے محروم ہیں سرکاری اور نیم سرکاری دفاتر کے دروازے اردو پر بند کر دیئے گئے ہیں، اردو کو [illegible] جمہوریت کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ اردو ان حالات میں بھی حتی الامکان ملک کی خدمت کرتی رہی چینی جارحیت کے موقع پر اس کے فن کار سیف قلم لے کر آگے بڑھے اور اب پاکستانی حملے کے وقت بھی اردو شاعر اور ادیب خاموش نہیں رہے انھوں نے اپنے فرض کو بڑی بے باکی کے ساتھ ادا کیا اور وہ ہر قسم کی قربانی کے لیے آمادہ ہو گئے۔ اردو کو اس اہم کام میں اولیت اور فوقیت حاصل ہے دوسری زبانوں کے مقابلہ میں [illegible] اردو ہی ہے جس کے شاعروں اور ادیبوں نے شمال سے لے کر جنوب تک اور مشرق سے لے کر مغرب تک ہر بڑے شہر میں قومی مشاعرے اور جلسے کیے اور عوام کے جذبات بیدار کیے جب کہ دوسری زبانیں اپنے اپنے علاقوں تک ہی محدود رہیں۔ اس کی اہمیت کو ارباب حکومت آل انڈیا ریڈیو کے ذمہ داروں نے بھی بڑی شدت سے محسوس کیا اور انھوں نے اس کے پروگرام بھی نشر کیے لیکن یہ پروگرام اب بہت کم ہونے کے برابر ہیں۔ بہر حال ہمیں کوشش کرتے رہنا چاہیے [illegible] اور آشتی کے ساتھ آئینی جمہوریت کی پوری پوری پابندی کے ساتھ جس طرح ہم نے سترہ اٹھارہ برس مسلسل جد و جہد جاری رکھی ہے آئندہ بھی جاری رکھیں گے۔ ہماری جد و جہد سے کم از کم دنیا پر یہ واضح ہو گیا کہ اردو کے نام لیوا جمہوریت اور اس کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں یہی ایک زبان ایسی ہے جس کے ہمدردوں کی کسی قسم کی جارحیت کے مرتکب نہیں ہوئے ہیں۔

فراق گورکھپوری۔ (صفحہ ۵ سے آگے)

فراق گورکھپوری کی شاعری میں ہندوستان کی مٹی کی خوشبو آتی ہے اور اس کی فضاؤں کا حسن و جمال جھلکتا ہے۔ "روپ" کی رباعیوں میں ہندوستانی حسن کی دیوی کو لڑکی، بیوی، بیٹی اور گھر کی لکشمی کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور امرت برسایا ہے چین کے حملے کے وقت ۲۶ جنوری ۱۹۶۲ء کو لال قلعہ دہلی کے مشاعرہ میں جو نظم فراق نے سنائی وہ کبھی نہیں بھلائی جا سکتی۔ ملک کے حالات حوصلہ شکن تھے، اور قوم پر اداسی اور بے بسی کا جذبہ چھایا ہوا تھا۔ اس احساس کو جس طرح فراق نے اپنے اشعار میں سمویا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ابھی تو ذکر سحر دوستو ہے دور کی بات
ابھی تو دیکھتے جاؤ بڑی اداس ہے رات
سنا ہے پہلے بھی ایسے میں بجھ گئے ہیں چراغ
دلوں کی خیر مناؤ بڑی اداس ہے رات

پروفیسر آل احمد سرور۔

پروفیسر آل احمد سرور نے سنجیدگی اور شائستگی سے ذوقِ جنوں کو ابھارا۔ ان کی یوم جمہوریت پر کہی ہوئی غزل کے دو شعر پیش کرتا ہوں۔

وطن میں آ رہا ہے انقلاب آہستہ آہستہ
حقیقت بن رہے ہیں سب کے خواب آہستہ آہستہ
کھنچے آتے ہیں حلقہ زنداں میں یہ جو دیر میں سارے
کھلا اس طرح مے خانے کا باب آہستہ آہستہ

جگن ناتھ آزاد۔

نوجوان لیکن ابھرتے ہوئے شاعر نے وطن کی محبت میں ڈوب کے شعر کہے یا نظمیں لکھیں۔ آزاد کو تقسیم ملک کے بعد مجبوراً اپنا وطن چھوڑنا پڑا جس سے اُن کے احساس دل کو چوٹ پہنچی۔ آزادی ملتے ہی قتل و غارت گری کا جو بازار گرم ہوا اس سے آزاد بہت متاثر ہوا اور کہا۔

نہ پوچھو جب بہار آئی تو دیوانوں پہ کیا گزری
ذرا دیکھو کہ اس موسم میں فرزانوں پہ کیا گزری
لہو دیر و حرم دا او یہ تمہنے کیا جنوں پھونکا
خدا کے گھر پہ کیا بیتی صنم خانوں پہ کیا گزری

موجودہ دور کے ترقی پسند شعراء نے غلامی کے خلاف جہاد کیا اور قومی تحریک کو مدد دی۔ انھوں نے کسانوں مزدوروں اور غریبوں کے حق میں آواز اٹھائی اور سماج کو نئے سرے سے ترتیب دینے پر زور دیا۔ ۱۹۴۷ء میں آزادی پا کر بھی اُن کو ملک کے حالات تلخ و تشنہ نظر آئے۔ ان کے خیال کے مطابق یہ آزادی ادھوری ہے اور ابھی جد و جہد کی ضرورت ہے۔ ان شاعروں میں مجاز، فیض احمد فیض، سردار جعفری، جذبی، ساحر لدھیانوی، اختر الایمان، مخدوم محی الدین، جاں نثار اختر، اور کیفی اعظمی نے شہرت پائی۔

مجاز نے کہا ہے۔

تو انقلاب کی آمد کا انتظار نہ کر
جو ہو سکے تو ابھی انقلاب پیدا کر

ایک اور موقع پر کہا کہ تخت و تاج مٹی میں مل جائیں گے اور غریبوں اور عوام کا راج ہوگا ؎

بول مری ادو دھرتی بول
راج سنگھاسن ڈانوا ڈول

فیض احمد فیض۔

فیض احمد فیض نے جیل کے اندر وطن کی یاد میں کہا۔

نہ گُل کھلے ہیں نہ ان سے ملے نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

ایک اور موقع پر کہا۔

زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ساحر لدھیانوی۔

ساحر لدھیانوی نے اپنی مشہور نظم "تاج محل" میں غریبوں کے احساس کی ترجمانی کی ہے۔ ایک دو شعر سنیئے ؎

ایک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لیکر
ہم غریبوں کی محبت کا اڑایا ہے مذاق
مری محبوب کہیں اور ملا کر مجھ کو

سردار جعفری۔

سردار جعفری نے اپنی پر زور نظموں سے ایک روح پھونک دی ہے ایک نمونہ لیجئے ؎

اٹھو ہند کے باغبانو اٹھو
اٹھو انقلابی جوانو اٹھو
غلامی کو زنجیر کو توڑ دو
زمانے کی رفتار کو موڑ دو

چین اور حال ہی میں پاکستان کے جارحانہ حملوں سے وطن کے لیے محبت کا جذبہ اس شدت سے ابھرا کہ دوست و دشمن حیران رہ گئے۔ ایسی ایکتا کبھی پہلے دیکھنے میں نہ آئی تھی۔ اس قومی جذبہ کو ابھارنے اور ایکتا کی فضا پیدا کرنے میں اردو شاعروں نے ایک خاص حصہ لیا۔ آزادی کے یہ نغمے ہمیشہ گونجتے رہیں گے اور اُن کا اثر نسلوں تک رہے گا۔

اب میں اپنے وطن کے شہیدوں کی یاد میں اپنے ایک قطعہ سے اس محفل کو ختم کرتا ہوں ؎

کیسے شمعِ وطن پہ ہنس ہنس کر
جل کے قرباں ہوئے ہیں پروانے
ان کی مٹی سے پیدا ہوں گے عجب
لاکھوں حسنِ وطن کے دیوانے

مراسلات

حضرت فراقؔ کی ایک غزل

"ہماری زبان" مورخہ یکم نومبر ۱۹۶۵ء کے صفحہ ۹ پر حضرت آغا خلش کاشمیری نے حضرت فراقؔ گورکھپوری کی تکرار قوافی کی غزل پر جو اظہار خیال کیا ہے اس کی میں اس حد تک تو تائید کرتا ہوں کہ درحقیقت حضرت فراقؔ کو یہ دعویٰ نہیں کرنا چاہیے تھا کہ تکرار قوافی کی یہ قید بالکل نئی ہے کیونکہ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے اس سرزمین میں ہزاروں شاعر دفن ہو گئے، ہزاروں موجود ہیں جن میں سے بیشتر شعراء کے دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ یہ دعویٰ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ میری نظر سے تمام شعراء کا کلام گذر چکا ہے۔ کچھ نہ کچھ نظر سے رہ ہی جاتا ہے۔ مجھے آغا خلش کاشمیری سے صرف اتنا کہنا ہے کہ انھوں نے جو تلخ لب و لہجہ اختیار کیا وہ یقیناً قابل ستائش نہیں بلکہ قابل صد افسوس ہے۔ ایک ادیب کو سلیقہ سے بات کہنی چاہیے اگر ادیب بھی ایک سطحی آدمی کی طرح بات کرنے لگے تو ادیب اور سطحی آدمی میں امتیاز کرنا مشکل ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ مجھے یہ اختلاف ہے کہ حضرت آغا خلش کاشمیری ایک نامور شاعر حضرت غلام محمد راحت سرمدی کی سنی ہوئی غزل کے قوافی اور حضرت بقاؔ کی تکرار قوافی کی غزل پر جو مصرع (بقاؔ کو چھوڑیے حضرت بکا بکا نہ بکا) انھوں نے چلتی کے طور پر رکھا تھا ثبوت میں دے کر رہ گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں غزلیں غیر مطبوعہ ہیں اس لیے ثبوت یقیناً کمزور ہے حضرت فراقؔ بالکل بے قصور ہیں۔ اگر یہ غزلیں مطبوعہ نہیں ہیں تو کیا انھیں یہ چاہیے تھا کہ یہ غزلیں حضرت راحت سرمدی اور بقاؔ صاحب سے طلب کر کے شائع کرانا چاہیے تھیں۔

نیازمند حضرت چندنؔ بھارتی کی غزل جو تکرار قوافی میں کہی گئی ہے ثبوت میں پیش کر رہا ہے۔ حضرت چندنؔ چودہ ۱۴ پندرہ ۱۵ سال سے اپنے سوزِ خلوص و محبت سے ٹونک کی بزم شعر و ادب کو چہکا رہے ہیں یہ اس تھوڑے سے عرصہ میں کافی مشہور ہو چکے ہیں۔ چار گیتوں کا مجموعہ "بہار چندن" اور غزلیات کا مجموعہ "سرچشمہ" طبع ہو کر منظر عام پر آ چکے ہیں۔ ان کا کلام جے پور اور حیدرآباد ریڈیو اسٹیشن سے اکثر نشر ہوتا رہتا ہے۔ راجستھان کا کوئی ایسا مشاعرہ نہیں ہوتا جس میں حضرت چندنؔ کو دعوت نہ دی جاتی ہو۔ مندرجہ بالا مجموعوں پر ہندوستان کے متعدد اور مشہور اخبار و رسائل بہت اچھے الفاظ میں تبصرہ کر چکے ہیں۔ مندرجہ ذیل غزل "سرچشمہ" میں موجود ہے۔ غزل ملاحظہ ہو۔

خیال تم نے کسی کا کیا کیا نہ کیا
مریض درد محبت جیا جیا نہ جیا
ہماری بات کسی نے سنی سنی نہ سنی
ہمیں جواب کسی نے دیا دیا نہ دیا
کسی کو یاد ہماری رہی رہی نہ رہی
کسی نے نام ہمارا لیا لیا نہ لیا
کسی کے ساتھ ہماری بنی بنی نہ بنی
کسی نے ساتھ ہمارا دیا دیا نہ دیا
وہ ملتفت مری جانب ہوئے ہوئے نہ ہوئے
علاجِ درد محبت کیا کیا نہ کیا
کسی سے آنکھ کسی کی ملی ملی نہ ملی
کسی نے جامِ محبت پیا پیا نہ پیا
جدا جدا ہے ادائے جنوں بھی اے چندنؔ
کسی نے چاک گریباں سیا سیا نہ سیا

(قوی ٹونکی)

قند فارسی

مولانا محمد حسین آزاد کی تصانیف کے ذکر میں حامد حسن قادری نے داستان تاریخ اردو میں اٹھارہ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ سات کتابیں ایسی ہیں جو ان کی زندگی میں شائع ہوئیں اور گیارہ کتابیں ان کی وفات کے بعد ورثا نے ان کے قلمی مسودات سے شائع کیا ہے۔ اس میں "قند فارسی" کا ذکر نہیں ہے۔ مجھے حال ہی میں قند فارسی دستیاب ہوئی ہے۔ "قند فارسی" میں فارسی میں روزمرہ گفتگو کا نمونہ درج ہے۔ مختلف عنوانات سے بات چیت کا نمونہ درج ہے کتاب چھوٹی تقطیع میں ہے کل صفحات ایک سو اٹھ ہیں۔ اس کتاب کی تمہید آزاد صاحب کے صاحبزادے محمد ابراہیم نے لکھی ہے۔ انھوں نے تمہید میں کتاب کے بارے میں لکھا ہے۔

"یہ کتاب والد صاحب نے ۱۸۸۰ء میں لکھی تھی۔ ان کا ارادہ سیاحت ایران کا بھی تھا اس لیے چھپوانا ملتوی رہا۔ ایران گئے تو مسودہ ساتھ لے گئے۔ کتاب کے آخر میں جو حاجی محمد صاحب شیرازی نے نوٹ لکھا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ حال کے لحاظ سے جس جگہ مناسب تھی اصلاح ہوئی ہے۔ والد مجد کے ایک بستہ میں سے اصل مسودہ جو ابتدا میں لکھا تھا اور اس کی دوسری نقل جو نظر ثانی میں ہوئی مجھے ملی۔ مسودہ ثانی ہے۔ یہ مختصر رسالہ فارسی کے مبتدیوں کے لیے مفید ہوگا۔ روزمرہ جو ضروری گفتگو گھروں، دوستوں، استادوں، شاگردوں یا صحبتوں میں ہوتی ہیں، اس میں درج ہیں۔ حاشیہ پر بارے ملکوں کے محاورے بھی لکھ دیے ہیں۔"

تمہید کے آخر میں تاریخ یکم اگست ۱۹۰۶ء لکھی ہے۔ اشاعت ۱۹۰۶ء ہے۔ نول کشور گیس پرنٹنگ ورکس لاہور میں چھپی ہے۔

ملنے کا پتہ خلیفہ سید محمد سالم منیجر آزاد بک ڈپو اکبری منڈی لاہور ہے۔ کوریج پر بار اول ۱۵۰۰ جلد اور قیمت فی جلد آٹھ آنے لکھا ہے۔

کوریج کے اندرونی حصے میں مولانا محمد حسین آزاد کی دوسری کتابوں کے اشتہار ہیں ان میں قند فارسی کے بارے میں بھی لکھا ہے:-

"قند فارسی۔ فارسی زبان کے سیکھنے کے لیے ایک مفید رسالہ ہے مصنف نے سیاحت ایران میں جو مختلف اشخاص سے گفتگوئیں کیں جو کارآمد ہیں تمام اس میں درج ہیں۔ زمانہ حال کی فارسی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔"

کتاب کے آخری صفحے ۱۶۰ پر نوشتہ دیگر الحاج محمد جعفر شیرازی المتخلص بطالب کی رائے درج ہے۔

"ایں کتاب را تمام وکمال بنظر دقت بملاحظہ نمودم بطریق محاورۂ اہل ایران درست میباشد ہر جائے آں کہ بجا درست نبود تصحیح نمودم۔"

(شریف الحسن لاہرپوری)

محمود نامہ (فارسی)

مورخہ ۲۲ راکتوبر ۱۹۶۵ء کے "ہماری زبان" کے شمارے میں جناب کاشف الہاشمی صاحب، او جینی نے "غالب کا ایک شاگرد محمد حسین محمود" کے متعلق صفحہ ۳ پر ایک مضمون لکھا ہے۔ جس میں انھوں نے ڈاکٹر محمود الٰہی صاحب کے اس معلوماتی مضمون کا حوالہ دیا ہے جو ۲۲ رنومبر ۱۹۶۴ء کے "ہماری زبان" کے شمارے میں شامل تھا۔ کاشف صاحب نے لکھا ہے کہ

"ہر ایک حرف کی ردیف میں غزل شامل ہے۔

صرف "گ" کی ردیف کو چھوڑ کر کل ۱۳۱ غزلیات ہیں۔

"گ" کی کمی "ک" کی ردیف سے پوری کی ہے۔"

میرے پاس بھی محمود نامہ (فارسی) ہے جو بارہ صفحات پر مشتمل ہے اور اس کے بارھویں صفحے پر آخر میں یہ عبارت لکھی ہوئی ہے۔

"بحمد اللہ کہ محمود نامہ تمام شد بماہ اگست ۱۹۰۰ء در مطبع محمدی واقع بمبئی طبع شد" اس محمود نامہ میں "گ" کی ردیف کی کمی کو پورا نہیں کیا گیا بلکہ "ک" کی ردیف میں ہی مندرجہ ذیل تین اشعار "گ" سے کہے ہوئے ہیں جو "ک" پر ہی ختم ہوتے ہیں۔ اشعار یہ ہیں۔

گوہر ہر کس و ناکس نشود از پی پیدا
نتواں یافت دگر بجوی لعل محک
گر نقاب از رخ زیبائی تو افتد ناگاہ
خلق عالم ہمہ حیران تو گردد بیشک
گوش بر گفتۂ کس نیست ترا از سر ناز
حال محمود چہ ساں با تو بگویم یکیک

مذکورۂ بالا اشعار کے آخر میں ردیف کا لحاظ نہیں رکھا گیا جس کی وجہ سے ردیف "گ" کی کمی پوری نہیں ہو سکی۔ اس محمود نامے میں بھی باقی تمام خصوصیات وہی ہیں جو کاشف صاحب کے بیان کردہ محمود نامہ کی ہیں۔

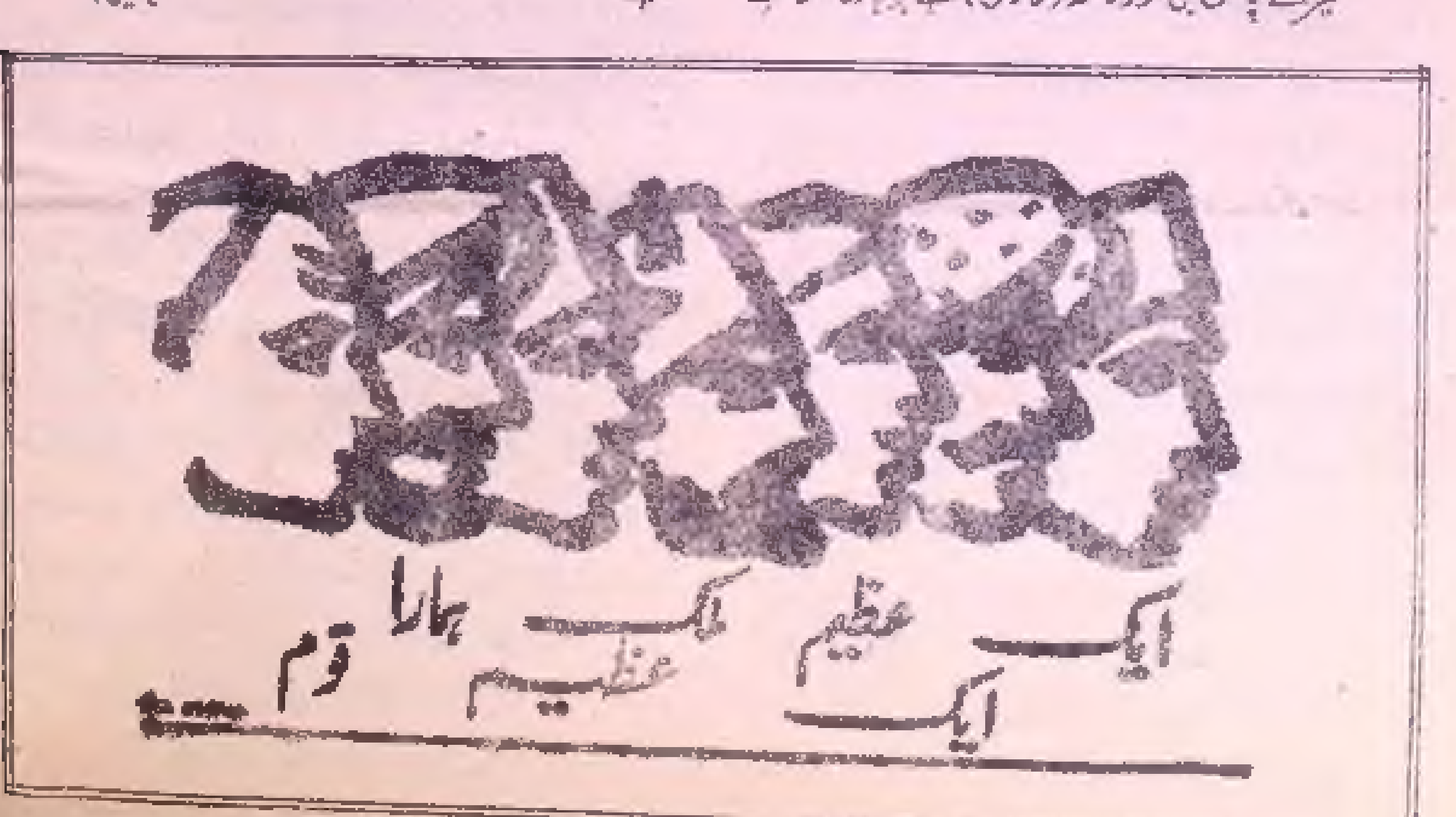
(جہانگیر جوہر)

فلسفہ و شعر کی اور حقیقت ہے کیا

حرفِ تمنا جسے کہہ نہ سکیں روبرو

ایک صاحب کہتے ہیں مندرجہ بالا شعر بحر بسیط کا ہے لیکن دوسرے صاحب مصر تھے کہ یہ شعر بحر منسوخ کا ہے ناظرین ہماری زبان سے درخواست ہے کہ وہ اس پر روشنی ڈالیں کہ دونوں میں سے کون حق پر ہے اور کون غلطی پر۔ اس کی جانچ کا کیا معیار ہے۔

(عابد کیفی)



انجمن ترقی اردو (ہند) علاقہ ودربھ کے سکریٹری کی نامزدگی

انجمن ترقی اردو مہاراشٹر نے علاقہ ودربھ کے لیے جناب فیض انصاری کو بحیثیت سکریٹری نامزد کر دیا ہے۔ علاقہ ودربھ کے اردو دوستوں سے درخواست ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں میں انجمن ترقی اردو کی شاخیں قائم کریں اور اس سلسلے میں جناب فیض انصاری، ایڈیٹر ماہنامہ "خیال" کامٹی سے خط و کتابت کریں۔

(مرکزی شعبۂ نشر و اشاعت انجمن ترقی اردو (ہند) مہاراشٹر)

بزم ادب حمیدیہ کالج بھوپال کی افتتاحی تقریب کی روداد

بھوپال (بذریعہ ڈاک) یہاں کے حمیدیہ کالج کی بزم ادب کے انیسویں سال کا افتتاح بیگم انیس قدوائی ممبر راجیہ سبھا نے کیا۔ حمیدیہ کالج کی بزم ادب فارسی، عربی اور اردو کے طلبا کی تہذیبی تنظیم ہے۔ یوں تینوں مضامین میں ڈگری کلاسز کے علاوہ پوسٹ گریجویٹ کلاسز بھی کالج میں کھلے ہوئے ہیں۔ بیگم قدوائی نے اپنی افتتاحی تقریر میں اردو والوں کو عملی بننے کا مشورہ دیا اور ان سے کہا کہ وہ نام نہاد ادیبوں اور شاعروں سے بچنے کی کوشش کریں۔

بیگم قدوائی نے نصف گھنٹہ تک اپنے افتتاحی خطبہ میں اردو ادب سے متعلق مختلف مسائل پر اپنے مخصوص انداز میں اظہار خیال کیا۔ آپ نے کہا ادب کو وقتی، ہنگامی اور تفریحی چیز بنا کر زندگی سے فرار کا راستہ نہ تلاش کیجیے۔ ادب صرف الفاظ کی ہنر مندی نہیں، وہ زندگی کے بہتے دھاروں کا رخ بدل سکتا ہے۔ آپ نے کہا کہ فکر و فن کی بلندیاں ابھی نہیں ہیں۔ جلتی آگ پر محبت کے چھینٹے دینے والے وہی ہو سکتے ہیں جنھیں سچائی عزیز ہے اور جو ہر خوبصورتی سے عشق رکھتے ہیں اور جو رحم، ہمدردی اور ظلم و تشدد کا فرق جانتے ہیں۔ آپ نے نئی نسل کو خطاب کرتے ہوئے کہا کہ یہ گھڑی محشر کی ہے۔ اس لیے جن ہاتھوں میں انسانیت کا مستقبل، امن عالم کا دارومدار اور اقدار حیات کی امانت ہے ہیں ان سے یہ ضرور پوچھوں گی کہ کیا وہ اپنا فرض ادا کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس موقع پر بزم کے سکریٹری کمال عباس نے رپورٹ پڑھی۔ شعبہ اردو کے قائم مقام صدر پروفیسر آفاق احمد نے معزز مہمان کا تعارف کرایا اور مس فرزانہ بشیر صاحبہ (نائب صدر) نے شکریہ ادا کیا۔ ایک مشاعرہ بھی ہوا جس میں مشفق بھوپالی، اختر سعید، فضل تابش ایم۔ اے۔ شمیم، درگا پرشاد، مظفر رئیس (صدر بزم ادب)، وغیرہ نے اپنا کلام پڑھا۔

(کمال عباس)

ادبی مجلس کریم نگر کے اجلاس میں جناب سرینواس لاہوٹی کی تقریر

کریم نگر۔ ۲۰ر نومبر انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر کی جانب سے ادیبوں اور شاعروں کی ایک ذیلی کمیٹی کا "ادبی مجلس" کے نام سے حال ہی میں قیام عمل میں آیا۔ اس کا پہلا اجلاس، کریم نگر ضلع کے اردو کارکنوں کے اجتماع کے موقع پر بتاریخ ۲۸ر نومبر ۱۹۶۵ء بوقت ۹ بجے شب بمقام ضلع پریشد کمیٹی ہال، بصدارت جناب قاضی محمد بشیر الدین نائب صدر انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر و صدر ادبی مجلس منعقد ہوا۔ حیدرآباد کے مشہور شاعر جناب فیض الحسن خیال نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ مسٹر ریاست علی صدیقی تاج کریم نگری معتمد ادبی مجلس نے صدر، مہمان خصوصی اور جناب سرینواس لاہوٹی کی گل پوشی کی۔

جناب سرینواس لاہوٹی معتمد تنظیمی انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے ادبی مجلس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا کہ اردو ادب میں متوازن تنقید کی ضرورت ہے۔ اردو ادب سے ناواقف اشخاص غالب اور اقبال کے تعلق سے جب مطالعہ کرتے ہیں تو وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ انھوں نے غالب کی مثال دیتے ہوئے کہا کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے کہا ہے کہ مقدس ویدوں کے بعد ہندوستان میں کوئی دوسری اہم کتاب ہے تو وہ دیوان غالب ہی ہے۔ اور ڈاکٹر سید عبداللطیف نے غالب کو ہندوستان کا سب سے گھٹیا شاعر قرار دیا ہے۔ ظاہر ہے ان متضاد رایوں کی وجہ سے قاری کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس لیے کسی ادیب و شاعر کو جاننے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ذہنی اور عقیدت کی بجائے علم و فن اور فکر و خیال کو بنیاد بنایا جائے اور یہ دیکھا جائے کہ زندگی سے جو بات لی گئی تھی وہ ادب یا شاعری میں پیش کی گئی ہے یا نہیں۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر ہم کسی بھی شخصیت کو بہتر طور پر جانچ سکتے ہیں۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ شاعروں اور ادیبوں کو ایک مرکز پر لانے کے لیے ضلع کی انجمن نے ادبی مجلس کا قیام عمل میں لا کر ایک بہتر اقدام کیا ہے۔

جناب سچت آنند راؤ ایڈوکیٹ نے "سماج کی ترقی میں ادب کا مقام" کے عنوان سے ایک مقالہ پیش کیا۔

جناب ریاست علی صدیقی تاج کریم نگری نے تعارف و تقریظ۔ "سوچ صبا کا شاعر اور اس کی کامیاب غزلیں" کے عنوان سے مسٹر فیض الحسن خیال کے کلام کے بارے میں ایک جامع تبصرہ پیش کیا ہے۔

اس کے بعد غیر طرحی مشاعرہ ہوا۔

جناب ابوالمکارم غازی الدین کمال کریم نگری معتمد انجمن ترقی اردو شاخ ضلع کریم نگر کے شکریہ کے ساتھ یہ جلسہ ختم ہوا۔

(ابوالمکارم غازی الدین)
سکریٹری

———×××———

آندھرا کے اردو کارکنوں کا تنظیمی جلسہ

حیدرآباد ۱۲ر دسمبر۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کے اضلاع کی شاخوں کے صدور، معتمدین اور کارکنوں کا تنظیمی جلسہ آج اردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوا۔ مسٹر کشن لال مصرا صدر انجمن ترقی اردو شاخ کریم نگر نے اجلاس کی صدارت کی۔ جناب حبیب الرحمٰن صاحب معتمد انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش نے جلسہ کی غرض و غایت پر روشنی ڈالی اور کہا کہ گذشتہ سال کے مقابلہ میں سال حال انجمن کی سرگرمیوں میں زیادہ اضافہ ہوا اور بہت سی نئی شاخوں کا قیام عمل میں آیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو کو فروغ دینے کے لیے مسلسل جد و جہد کی ضرورت ہے۔ تمام اضلاع اور تعلقہ جات کی شاخوں سے اپیل کی کہ وہ تعلیمی مسائل پر خصوصی توجہ کریں اور اضلاع کی شاخوں کے تحت ایک رابطہ کے قیام پر بھی زور دیا گیا۔ کرنول، نیلور، گنٹور (کریم نگر) کوسگی (محبوب نگر) ونپرتی (محبوب نگر) ہندو پور، کدری، گنتکل اور ادونی کی انجمنوں کی شاخوں کا مرکز سے الحاق کا اعلان کیا گیا۔ جناب نصرت فاروقی (محبوب نگر) نے اس بات پر زور دیا کہ ضلع کی سطح پر مقامی انجمنوں کو کام کرنے کے پورے اختیارات دیئے جائیں۔ مدارس میں اردو تعلیم کے خاطر خواہ انتظامات کی طرف توجہ دلانے کا مطالبہ کیا۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سابق ایم۔ پی نے کہا کہ انجمن ترقی اردو کل ہند سطح پر اردو زبان کی خدمت کر رہی ہے۔ انھوں نے انجمن ترقی اردو کی اضلاع و تعلقہ جات کی شاخوں کا ریاستی انجمن ترقی اردو سے الحاق کرنے پر زور دیا۔ ضلع کی سطح پر اردو کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مشاورتی اجتماع منعقد کرنے کی تجویزیں بھی پیش کی ہیں۔ جناب اے کے فرید خاں (کدری ضلع اننت پور) نے کہا ہے کہ ریاستی انجمن اضلاع اور تعلقہ جات کی شاخوں سے راست ربط رکھے۔ ساتھ ہی تعلقہ کی شاخوں سے اپنا ربط پیدا کر۔ جناب خواجہ معین الدین (کاماریڈی) نے کہا کہ مقامی ضلع پریشد، اسکول میں انجمن ترقی اردو کی جانب سے نمائندگی پر نویں جماعت کے علاوہ دسویں گیارھویں جماعت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ سردار جمیل احمد (جوگی پیٹھ) نے کہا ہے کہ اس تعلقہ کے مدارس میں اردو جماعتیں قائم ہیں اور اردو ٹیچرس کو فراہم کرنے میں تاخیر ہوتی ہے۔ اس کے ازالہ پر زور دیا گیا۔ مسٹر عبدالاحد (ضلع اننت پور) نے اس بات پر زور دیا کہ وقتاً فوقتاً ریاستی انجمن کے عہدہ داروں کو اضلاع اور تعلقہ جات میں روانہ کیا جائے تاکہ کام کو آگے بڑھانے میں مدد ملے گی۔ جناب عبداللطیف (ہندو پور) نے کہا کہ انجمن کی شاخوں میں اضافہ کرنے کے لیے قواعد میں نرمی پیدا کرنی چاہیے۔ جناب شیخ احمد (کھمم) نے اردو ٹیچرس کے آئے دن تبادلوں کے طریقہ کار کی مذمت کی اور کہا کہ اس طریقہ کار سے اردو تعلیم متاثر ہو رہی ہے۔ جناب ابوالخیر صہبا (بودھن) نے کہا کہ یہ بات درست نہیں جبکہ ضلع مستقر پر قائم شدہ انجمن ہی ضلع پریشد کی سطح پر کام کر سکتی ہے۔ جناب پیر نظامی (اننت پور) نے اس قسم کے تنظیمی اجتماع ضلع کی سطح پر منعقد کرنے پر زور دیا۔ جناب اکبر شریف رحجوری، گلال کریم نگر، راسیشور راؤ نے بھی خطاب کیا۔ جناب کشن لال مصرا نے اپنی صدارتی تقریر میں تعلیمی مسائل پر تفصیلی روشنی ڈالی اور اضلاع کی شاخوں کے ریاستی انجمن سے راست الحاق پر زور دیا۔ جناب سرینواس لاہوٹی معتمد تنظیمی انجمن ترقی اردو آندھرا نے تفصیلی رپورٹ پیش کی اور ان کے شکریہ پر جلسہ اختتام کو پہونچا۔

(نامہ نگار)

دلی یونیورسٹی کی انجمن تحقیقات کا جلسہ

دلی ۲۹ر نومبر۔ دلی یونیورسٹی کی انجمن تحقیقات اردو کا جلسہ ۹ر نومبر دو شنبہ کو ٹیوٹوریل بلڈنگ آڈیٹوریم میں ڈاکٹر یوسف حسین خاں کی صدارت میں منعقد ہوا۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کا استقبال کیا اور ان کی ادبی خدمات پر روشنی ڈالی۔

جناب جاوید وششٹ استاد شعبۂ اردو دلی کالج نے محمد قلی قطب شاہ کا رنگ تغزل کے عنوان سے مقالہ پڑھا۔

مباحثے کے بعد ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب نے قلی قطب شاہ کی شاعری پر مختصر تقریر کی۔

مباحثے میں شریف احمد صاحب، ڈاکٹر ظہیر احمد صاحب صدیقی اور نعیم احمد صاحب اور افسری افتخار صاحبہ نے حصہ لیا۔ آخر میں ڈاکٹر محمد حسن صاحب نے شکریہ ادا کیا۔

(ڈاکٹر محمد حسن)

شامِ انیس

علی گڑھ-۱۲ر دسمبر انجمن اردوئے معلیٰ (شعبہ اردو) علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے زیر اہتمام شامِ انیس منائی گئی۔ اس جلسے کی صدارت پروفیسر آلِ احمد سرور صاحب نے کی۔ ڈاکٹر وحید اختر اور راہی معصوم رضا نے انیس کی شاعری پر دو مقالے پڑھے اور خواجہ مسعود علی ذوقی صاحب نے انیس کے ایک مرثیہ کے کچھ اقتباسات اپنے مخصوص انداز میں سنائے۔ جلسے کے خاتمے پر سرور صاحب نے دونوں مقالات کو سراہا اور انیس کی شاعری کے عناصر ترکیبی پر اظہار خیال کیا۔

(نامہ نگار)

راوی کا ایک جلسہ

علی گڑھ-۱۱ر دسمبر ۱۹۶۵ء کو کہانی کاروں کی انجمن "راوی" کا ایک جلسہ زیر صدارت جناب ڈاکٹر عبدالعلیم ہوا۔ اس جلسے میں ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر یٰسین صدیقی، ڈاکٹر ریندر بہادر اور صدر جلسہ ڈاکٹر عبدالعلیم صاحب نے "ادب میں جدیدیت" کے موضوع پر تقاریر کیں۔ تمام مقررین نے اس بات پر اتفاق کیا کہ "جدیدیت" بذات خود کوئی قدر نہیں ہے اس لیے وہ تخلیقات جو جدید پائی ہیں اسی وقت قابل قبول ہو سکتی ہیں کہ ان کی بنیاد انسانی تجربات پر ہو۔

(نامہ نگار)

ڈاکٹر نارنگ کے اعزاز میں استقبالیہ

۲۹ر اکتوبر کی شام کو "بزم ادب" جامعہ ملیہ، دلی یونیورسٹی کی طرف سے جامعہ ملیہ میں شعبۂ اردو کے صدر ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کو ان کی امریکہ سے آمد پر ایک استقبالیہ پیش کیا گیا۔ جلسۂ استقبالیہ میں شعبۂ اردو کے طلبہ، اساتذہ کے علاوہ دلی کے نامور ادیبوں اور شاعروں نے بھی شرکت کی۔

اس موقع پر ڈاکٹر نارنگ نے امریکہ میں اردو زبان کی تعلیم کے مسائل پر ایک مدلل تقریر کی۔

(سکریٹری)

آسوتوش انسٹی ٹیوٹ (کلکتہ) میں

اردو کلاس

کلکتہ میں آنجہانی سر آسوتوش مکھرجی سابق جج کلکتہ ہائی کورٹ اور سابق وائس چانسلر کلکتہ یونیورسٹی کے نام پر "آسوتوش انسٹی ٹیوٹ آف لینگویجز" کے نام سے پچھلے پانچ سال سے ایک ادارہ قائم ہے جہاں پہلے مختلف ملکی و غیر ملکی زبانوں کے پڑھنے کا انتظام تھا لیکن اردو کے لیے کوئی نظم نہیں تھا۔ اردو ہفتہ کے اختتامی جلسہ میں یکم ربیع سنہ ۶۵ء کو انجمن نے ایک تجویز کے ذریعہ ادارہ مذکور سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے یہاں اردو کی تعلیم کا بھی انتظام کرے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ انجمن کی ان کوششوں سے اس ادارے میں اردو کی تعلیم کا باقاعدہ نظم کر دیا گیا ہے ایک اردو لکچرر پابندی کے ساتھ کلاس لیتے ہیں اور غیر اردو داں بالغوں کی ایک بڑی تعداد کلاس میں شریک ہوتی ہے۔ ادارہ مذکور نے ڈپلوما و ڈگری دونوں طرح کا کورس رائج کیا ہے۔ کلاس میں شریک ہونے والے بیشتر طلبہ بنگالی ہیں، یہ اردو کی مقبولیت کا ثبوت ہے۔

(ایم۔ اے مجید جنرل سکریٹری
ریاستی شاخ مغربی بنگال)

علی گڑھ میں اردو زبان و ادب کی تعلیم پر سیمینار

شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے اردو زبان و ادب کی تعلیم سے متعلق ایک سیمینار کا انعقاد کیا جا رہا ہے جس میں کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نوجوان اساتذہ شرکت کے لیے تشریف لا رہے ہیں۔

سیمینار کا افتتاح پروفیسر خواجہ غلام السیدین صاحب ممبر ایجوکیشن کمیشن ۳۰ر دسمبر کو فرما رہے ہیں۔

یہ سیمینار ۳۰ر دسمبر ۱۹۶۵ء سے ۲ر جنوری ۶۶ء تک ہوگا اس میں ہندوستان کے متعدد اساتذہ مختلف تعلیمی موضوعات پر اپنے مقالات پڑھیں گے اور مباحثوں میں حصہ لیں گے۔ یہ سیمینار اردو زبان میں اپنی نوعیت کا پہلا اجتماع ہوگا۔
(نامہ نگار)

صفحہ ۱۲ کا بقیہ

احتشام صاحب کے واضح نقطۂ نظر اور ان کی اصابت رائے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک مضمون لسانیات سے متعلق ہے جس کا عنوان ہے "ہند آریائی مسلمانوں کی آمد سے پہلے"۔ ایک مضمون ہندی ناٹک پر اور ایک امریکی تنقید پر ہے۔ اردو کے رومانوی افسانہ نگاروں پر، اردو شاعری میں قومیت جائزے کی حیثیت رکھتے ہیں، اودھ اور رامپور کی ادبی فضا پر جو مضامین ہیں وہ غالباً ریڈیو کی تقریریں ہیں۔ دو انٹرویو بھی شامل کر دیئے گئے ہیں۔ ایک غزل سے متعلق اور ایک احتشام صاحب کی اپنی تنقید سے متعلق۔

ان کے علاوہ بھی چھوٹے بڑے کئی مضمون ہیں۔ ان مضامین میں طرز تحریر بھی ایک سا نہیں ہے۔ کہیں بہت مخصوص اور سنجیدہ بحث ہے کہیں ہلکا پھلکا تاثراتی انداز ہے کہیں عالمانہ نظر ہے تو کہیں انشائیہ کی سی کیفیت ہے۔ اس مجموعے سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ احتشام صاحب نقاد محض نہیں ہیں۔ وہ بنیادی طور پر ایک ادیب ہیں اور انھیں ادب اور زندگی کے متنوع پہلوؤں سے دلچسپی ہے۔

تبصرہ

خلیل الرحمن اعظمی

اعتبار نظر

مصنف: سید احتشام حسین
ناشر: کتاب پبلشرز، چوک لکھنؤ ۳
قیمت: چار روپے پچاس پیسے

سید احتشام حسین موجودہ دور کے ان چند معتبر اور محترم ادیبوں میں سے ہیں جنھیں جدید اردو ادب کا معمار کہا جا سکتا ہے ان کی تحریروں میں ایک عالمانہ سنجیدگی ہوتی ہے جس کا اعتراف وہ لوگ بھی کرتے ہیں جنھیں عام طور پر ان کے تنقیدی نقطۂ نظر سے اتفاق نہیں ہے لیکن یہ امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جہاں بھی ان کی شخصیت اور ان کی ادبی کارگزاریاں معرض بحث میں آتی ہیں وہاں انھیں محض "نقاد" کی حیثیت سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے قلم سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو ان کی "تنقید" سے تعبیر کیا جاتا ہے اسی انداز نظر کے اختیار کرنے کے سبب سے ان کے بارے میں جو رائیں دی جاتی ہیں ان میں عام طور پر افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ احتشام صاحب کی کئی حیثیتیں ہیں اور اسی اعتبار سے ان کے مضامین اور تحریریں بھی مختلف اور متنوع خصوصیات کی حامل ہیں اور جب تک ان تمام حیثیتوں کو سامنے نہ رکھا جائے ان کے ساتھ انصاف نہیں کیا جا سکتا۔

احتشام صاحب اردو زبان و ادب کے معلم ہیں اور ان کی زندگی کا بیشتر حصہ تعلیم و تدریس میں گزرا ہے۔ وہ زبان و ادب کے مسائل پر غور و خوض کرتے ہیں، اس سے متعلقہ علوم کا مطالعہ کرتے ہیں مختلف نظریات و عقائد، تاریخی، سیاسی، سماجی، عمرانی، معاشی اور تہذیبی عوامل کی چھان بین کرتے ہیں اور ان کی مدد سے قدیم و جدید ادب کی مخصوصیت اور خصوصیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایک ادیب کی حیثیت سے بعض ابھرتی ہوئی ادبی تحریکوں میں شریک رہے ہیں اور جن خیالات و تصورات پر ان کا ایمان رہا ہے ان کی تشریح و تفسیر کا فرض بھی انھوں نے لیا ہے اور ضرورت پڑی ہے تو ان کی مدافعت بھی کی ہے۔ ایک اہم اور معروف اردو ادیب کی حیثیت سے ان کے فرائض میں یہ بھی شامل ہے کہ وہ مدیران رسائل کی بعض ایسی فرمائشوں کو بھی حتی الامکان پوری کرنے کی کوشش کریں جب وہ کسی خاص موضوع سے متعلق یا اردو ادب کی کسی صنف کے بارے میں یا اردو کے کسی اہم ادیب یا شاعر پر کوئی خاص نمبر نکالتے ہیں۔ اسی طرح ریڈیو والے جب کسی موضوع پر دس پندرہ منٹ کی تقریر کے لیے کہتے ہیں تو ان سے دامن بچانا بھی مشکل ہو جاتا ہے اسی طرح ریڈیو کے لیے یا بعض رسالوں کے لیے نئی کتابوں پر تبصرے کا سوال ہے جن کو ٹالنا آسان نہیں ہے۔ پھر بعض نئے ادیب و شاعر اپنی کتابوں پر دیباچہ، تعارف یا پیش لفظ کے لیے اصرار کرتے ہیں تو ان کی دلشکنی احتشام صاحب کے بس کی بات نہیں ہے جنھیں نئے ادیبوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں اس لیے مسرت ہوتی ہے کہ اردو میں جہاں بھی اور جس نوع کا بھی کچھ کام ہو رہا ہے اس سے بہر حال ہماری زبان کی وسعت و ترقی وابستہ ہے۔ اسی طرح بعض جلسوں پر انھیں توسیعی لکچر کے لیے مدعو کیا جاتا ہے بعض کانفرنسوں یا جلسوں کی صدارت تفویض کی جاتی ہے بعض جگہوں پر کسی موضوع سے متعلق تقریر یا کسی مباحثے کا آغاز کرنے کے لیے فرمائش کی جاتی ہے۔ بعض ادیب اپنی نئی کتابیں تحفے کے طور پر بھیجتے ہیں تو انھیں اصرار ہوتا ہے کہ احتشام صاحب اپنے تاثرات کا اظہار کسی نہ کسی صورت سے کریں خواہ وہ خط کی چند سطریں ہی کیوں نہ ہوں۔

احتشام صاحب کی ان تمام حیثیتوں کو سامنے رکھا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ ان کی زبان یا قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ ایک سطح کا نہیں ہوتا اور نہ ان کی ہر تحریر کو ان کی ناقدانہ حیثیت کے تعین میں استعمال کرنا چاہیے ان کے مضامین کے متعدد مجموعے مختلف اوقات میں نکلتے رہے ہیں جن میں ان کے اہم تنقیدی مضامین کے ساتھ ساتھ بعض خطبے، تقریریں، تبصرے، لسانی، تاریخی، تحقیقی یا تمدنی مسائل سے متعلق بعض یادداشتیں وغیرہ بھی شامل کر دی گئی ہیں اور ان کے شامل کرنے کا مقصد یہ ہرگز نہیں ہے کہ ان سب کو ایک ہی نظر سے پڑھا جائے بلکہ ان کی شمولیت کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب تحریریں کسی نہ کسی نوع سے زبان و ادب یا تہذیبی مسائل کے سمجھنے میں ہماری مدد کر سکتی ہیں اور ان سے نہ صرف ادیب یا نقاد بلکہ نوجوان طلبہ اور معلم بھی استفادہ کر سکتے ہیں۔

"اعتبار نظر" بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ مضامین ہے جس میں "اصول نقد" "غزل، ایک مطالعہ" اور "غالب کی بت شکنی" ایسے معرکے کے مضامین ہیں جنھیں بجا طور پر جدید اردو تنقید کے چند اہم اور فکر انگیز مضامین میں جگہ دی جائے گی۔ اسی طرح "ماضی کا ادب اور نئے تنقیدی رد عمل" بھی خیال انگیز مضمون ہے اور قدیم ادب سے متعلق اس میں بعض ایسی باتیں کہی گئی ہیں جو اس سے پہلے عام طور پر نہیں کہی گئیں۔ "ادب اور جمود" "ادب، حب الوطنی اور وفاداری" اور وہ تقریر جو موجودہ اردو افسانے پر ہے معاصر ادب سے متعلق بعض اہم سوالات کو سامنے لاتی ہے اور اس سلسلے میں

(باقی صفحہ ۱۱ پر)

مالک انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ، پرنٹر ضمیر الدین قریشی نے مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ میں چھاپا، اور پبلشر نذر رحمن نے دفتر مرکزی انجمن ترقی اردو (ہند)، علی گڑھ سے شائع کیا۔